جاوید غامدی صاحب اور اُن کی عربی۔ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر سیّد رضوان علی ندوی

جاوید غامدی صاحب نے ٹی وی چینل ''آج'' کی بدولت گزشتہ دوتین سالوں میں کافی شہرت حاصل کی ہے۔عوام الناس میں اُن کی ایک دوسری وجہ شہرت حدود آرڈیننس ۱۹۷۹ء کے خلاف مختلف ٹی وی پروگراموں میں اُن کے بیانات تھے،لیکن اِس سب سے قطع نظر لاہور میں اُن کا ایک دینی حلقہ ہے؛ ایک خاص تدریسی پروگرام ایک ادارے کے تحت چلتا ہے جس کو اُنھوں نے ''المورد'' کا ثقیل عربی نام دیا ہے، درحقیقت یہ بیروت سے شائع شدہ ایک لغت کا نام ہے، اِس ادارے سے ''تجدّد پسندی'' یا جدیدیت کے شیدائی نوجوان مردوخواتین وابستہ ہیں۔

وہ اپنے آپ کو مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا ''خلیفہ'' کہتے ہیں، اور خود اصلاحی صاحب مولانا حمیدالدین فراہی مرحوم کے شاگرد رشید اور علمی خلیفہ تھے،اس طرح جاوید غامدی صاحب مولانا فراہی کے مکتب فکر کے نمائندہ ہیں۔اور فراہی صاحب گو بڑے محقق اور ذہین وفطین عالم تھے،اور قرآنی علوم وتفسیر قرآن ان کا خاص موضوع تھا،لیکن فہم قرآن کے سلسلے میں اُن کا سارا دارومدار جاہلی عربی شعروشاعری پر تھا،سُنّت نبوی یا ذخیرۂ احادیث میں جو تفسیر قرآنی ہے، یا اُس ذیل میں صحابہؓ وتابعینؒ سے ہماری قدیم تفاسیر میں جو کچھ منقول ہے، اِس سب سے اُن کو کوئی سروکار نہ تھا، چونکہ مولانا فراہی صاحب کا یہ مسلک سلفِ صالحین اور بعد کے ائمہ تفسیر کے خلاف تھا، اِس لیے اُن کے تفسیری منہج کو اُمّت میں وہ مقبولیت حاصل نہ ہوئی جو قدیم وجدید دیگر مفسرین قرآن کو حاصل ہوئی۔ بہرحال اِس وقت ہمارا موضوع یہ نہیں بلکہ جاوید غامدی صاحب کی عربی زبان کی مہارت ہے،جس کے وہ بڑے طمطراق کے ساتھ مدّعی رہے ہیں۔اگرچہ اب اُن کی عربی تحریریں اُن کے ماہنامے ''اشراق'' میں نہیں چھپتی ہیں۔لیکن ماہنامہ ''ساحل'' کے ایڈیٹر صاحب نے

۱۹۸۲ء میں ''الاعلام'' میں شایع شدہ اُن کی بعض عربی نگارشات برائے تبصرہ بھیجی ہیں تا کہ اُن کی عربی دانی کی حقیقت منظرِ عام پر آسکے۔

محترم جناب غامدی کے لقب کا پس منظر

لیکن اِس سے پہلے یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ جاوید غامدی صاحب سے میری کوئی ذاتی شناسائی نہیں، کافی عرصہ پہلے غائبانہ تعارف، میرے مرحوم مجلّہ ''البیان'' کے اشراق سے تبادلے کے سلسلے میں ہوا تھا، غالبًا اِسی زمانے میں میں نے اُن کی عربی نسبتِ تسمیہ کے استفسار کے لیے ایک خط لکھا تھا، یہ ۱۹۸۹ء کی بات ہے کہ میں سال دو سال قبل ہی ریاض میں طویل قیام کے بعد کراچی واپس آیا تھا، ریاض کی اسلامک یونیورسٹی جامعۃ الامام محمد بن سعود میں میرے متعدد سعودی شاگردوں کے ناموں کے ساتھ ''غامدی'' کا لاحقہ تھا۔ یہ درحقیقت ایک عرب قبیلے ''بنی غامد'' کی طرف نسبت ہے، اور یہ قبیلہ سعودی عرب کے جنوب میں نجران کے علاقے میں آباد ہے، اِس قبیلے کے لوگ یمن میں بھی آباد ہیں، اور اِسی قبیلے سے وہ عورت ''غامدیہ'' تھی جس کو اُس کے دو ڈھائی سال مسلسل اعترافِ زنا کی بنا پر اور پاک ہونے کے لیے اُس کے اجرائے حدِ رجم کے اصرار کے سبب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ماعز اسلمی کے ساتھ رجم (سنگساری کے ذریعہ موت) کی سزا دی گئی تھی۔ یہ قصہ حدیث وفقہ کی کتابوں میں بہت مشہور ہے۔

دوسروں کے آبا وَ اجداد سے نسبت جوڑنے والا رسالت مآبؐ کی نظر میں

میں نے سعودی عرب سے قریب العہد ہونے کے سبب خیال کیا کہ شاید یہ جاوید غامدی صاحب ''بنی غامد'' کی نسل کے کوئی عرب ہوں گے، جو پاکستان میں آباد ہو گئے اور اُردو میں لکھنے لگے ہیں۔ تحریری مختصر جواب جو آیا تھا اس سے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ موصوف نے لکھا تھا کہ درحقیقت ان کے ایامِ طفولت میں یمن (شاید سعودی عرب) سے کوئی عرب صاحب ان کے والد سے ملنے آئے تھے جن کے نام کا آخری حصہ ''غامدی'' تھا، جاوید صاحب کے والد صاحب کو یہ نام اچھا لگا اور انھوں نے اس کو اپنے بیٹے جاوید کے نام کا حصّہ بنا دیا۔ مجھے اس بات پر بہت تعجب ہوا تھا کیونکہ حدیث نبوی: ''من انتسب الی غیر ابیه......'' میں اِس کی سخت ممانعت کی آئی ہے کہ کوئی شخص اپنے آباء واجداد یا اپنے قبیلے کے سوا کسی دوسرے قبیلے یا آباء و اجداد کے ساتھ اپنی نسبت جوڑے۔ حدیث میں مذکورہ بالا جملے کے بعد ہے: **وتولیٰ غیر موالیه فعلیه لعنة اللّٰه و الملائکة و الناس اجمعین** (جو اپنے باپ یعنی آبا و اجداد کے علاوہ کسی دوسرے باپ اور اپنے مالک یا آقا کے سوا کسی دوسرے آقا کے ساتھ اپنی نسبت جوڑے تو ایسے شخص پر اللہ اور فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے (ابن ماجہ، کتاب الحدود، باب: ۳۶) اسی باب کی ایک دوسری حدیث میں ہے کہ ''ایسے شخص پر جنت کی خوشبو حرام ہے''، ہوسکتا ہے کہ جاوید صاحب کے والد اِس حدیث سے واقف نہ ہوں، لیکن

یقین ہے کہ وہ خود تو اِس حدیث سے واقف ہوں گے، اور تعجب اس بات پر ہے کہ حصولِ علم کے بعد انھوں نے اِس نسبت کو اپنے نام کے ساتھ کیسے باقی رکھا؟ بہر حال یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے، لیکن مجھے اِس سے غلط فہمی ہوئی تھی اور ہوسکتا ہے کہ بعض دوسرے لوگوں کو بھی ہوتی ہو۔

اب جہاں تک اُن کی عربی نگارشات کا تعلّق ہے تو میرے سامنے ان کے مجلّہ ''الاعلام'' میں شایع شدہ مندرجہ ذیل مضامین ہیں:

۱۔شرح شواهد الفراهی (۱)

۲۔شرح شواهد الفراهی (۲)

۳۔تعال نقتبس من نور اسلافنا

۴۔کتاب المفردات

غامدی صاحب عصری عربی اسلوب سے بےخبر ہیں

ان مختصر عربی مضامین کے بارے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے اندازِ بیان میں وہ عیب ہے جو عربی زبان میں ''عجمہ'' یعنی عجمیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ساتھ ہی ان کی عربی تحریریں پڑھ کر یہ احساس ابھرتا ہے کہ یہ عربی زبان کے عصری اسلوب سے بےخبر ہیں۔ اُنھوں نے بیسویں صدی کے مشہور ادباء مصطفٰی صادق الرافعی، لطفی المنفلوطی، محمود احمد شاکر، طٰہٰ حسین، احمد حسن الزیات، احمد امین، احمد تیمور باشا وغیرہ مصری ادباء وعلماء اور محمد کرد علی، خلیل مردم بک، بہجۃ البیطار، علی طنطاوی شامی اور بادو علماء اور اسی طرح عراق، سعودی عرب اور مراکش کے ادیبوں اور مصنفین کی تحریروں کو نہیں پڑھا ہے، ورنہ ان کی عربی کا وہ اسلوب نہ ہوتا جو مذکورہ بالا تحریروں میں ہے اور جس سے بوسیدگی کی بوآتی ہے۔ یا پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی طالب علم کے سامنے قدیم عربی کی کتابیں ہیں، وہ ان کے جملے، تشبیہات واستعارات اپنی تحریر میں منتقل کر رہا ہے۔

غامدی صاحب کی عربی نثر نحوی اغلاط سے پُر ہے

ہر زبان کا مختلف زمانوں کا اپنا اسلوب ہوتا ہے، اگر آج کوئی چوسر Chaucer شیکسپیئر وملٹن کے زبان میں انگریزی لکھنے لگے یا ولی دکھنی اور میر وسودا بلکہ میر امن کی طرح اُردو لکھے تو یہ مضحکہ خیز اور نا قابل قبول بات ہوگی۔ چلیے اس کو بھی تسلیم کرلیا جاتا مگر کیا کیا جائے کہ ان کی مذکورہ بالا تحریروں میں نحو یعنی قواعد زبان کی ایسی غلطیاں ہیں کہ کسی عرب کالج واسکول کا لڑکا بھی نہیں کرے گا، بلکہ دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سے شایع ہونے والے عربی ماہنامے البعث الاسلامی میں لکھنے والے نوجوان ندوی بھی ایسی اغلاط نہیں کرتے، مثالیں آئندہ آئیں گی۔ یہ عربی مجلّہ پچپن سال سے برابر نکل رہا ہے اور اگر چہ

اس میں لکھنے والے زیادہ تر ندوی اساتذہ وطلبہ ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں سعودی عرب مصر وشام و مغرب عربی کے اساتذہ بھی مضامین ومقالات لکھتے ہیں، کاش کہ اگر عربی مجلّات سے جاوید احمد غامدی صاحب کا تعلق نہیں رہا ہے تو وہ اس ہندوستانی مجلّے ہی کو زیرِ مطالعہ رکھتے تو اُن کو صحیح و دلآویز عربی لکھنا آجاتی، آج اگر کوئی امرؤ القیس کے انداز میں اپنی عربی نظموں میں عقنقل اور سجنجل جیسے متروک اور غیر عصری الفاظ استعمال کرے تو یہ ایک مضحکہ خیز بات ہوگی، عربی زبان کا اسلوب عہدِ اموی اور عہدِ عباسی سے آج تک برابر بدلتا رہا ہے۔ پانچویں وچھٹی صدی ہجری میں الحریری، القاسم بن علی (وفات ۵۱۵ھ) کے لغویانہ اندازِ نگارش اور مسجّع تحریر نے عربی زبان کو بڑا نقصان پہنچایا، یہ ایک طرح سے لسانی پہلوانی تھی، یہ اسلوب عہدِ نبوی، عہدِ اُموی اور عہدِ عباسی کی سادہ و دلآویز نثر سے بالکل جدا تھا، افسوس کہ چھٹی و ساتویں صدی ہجری اور بعد کے عہدِ انحطاط میں لوگ اس مصنوعی اسلوب کے اسیر ہوگئے جس میں تکلّف ہی تکلّف اور آورد ہی آورد تھی، اور برصغیر کے علماء وادباء تو اس متکلّف اور مردہ اسلوبِ نگارش کے ایسے شیفتہ وشیدا بلکہ اسیر ہوئے کہ وہ اپنی تحریروں میں اس اسلوب سے باہر قدم ہی نہ رکھ سکے، عربی دنیا میں پہلے ابن خلدونؒ نے سجع کے ذریعہ عبارت آرائی چھوڑ کر سادہ ومتین اسلوب اختیار کیا اور برِصغیر میں یہ امتیاز شاہ ولی اللہ صاحب کو حاصل ہوا، حجۃ اللہ البالغۃ کی نثر سادہ علمی نثر کی مثال ہے۔ مشہور ہے کہ انھوں نے مقامات حریری نہیں پڑھی تھی، اسی طرح تیرہ صدیوں میں برِصغیر کے مایہ ناز اور عرب دنیا میں مُسلم ادیب مرحوم مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ (علی میاں) نے مقامات حریری نہیں پڑھی تھی، اور غالبًا ان کے رفقاء مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا ناظم ندوی مرحوم نے بھی مقامات حریری درساً نہیں پڑھی تھی، اور راقم السطور نے بھی اپنے یک سالہ تعلیمی قیام ندوہ میں اسے نہیں پڑھا اور عرب ممالک، حجاز وشام جہاں بعد میں میری تعلیم کی تکمیل ہوئی وہاں تو مقامات حریری پڑھائی ہی نہیں جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اِس ناچیز کی عربی کتب جو بیشتر عرب ممالک میں چھپی ہیں، اِس مردہ و بے جان اور کرتبی اسلوب سے پاک ہیں۔

انیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں حریری کے مسجّع ومقفّیٰ نثر کے خلاف بغاوت کا ظہور ہوا، اور علی باشا مبارک، محمد عبدہ، احمد تیمور باشا، احمد زکی پاشا وغیرہ کے اثر سے اس عربی زبان میں لکھنے کی ریت پڑی جو عباسی عہد میں رائج تھی۔ بیسویں صدی کے مصری وشامی اُدبا کے طفیل عربی زبان دوبارہ اپنے عروج پر پہنچ گئی، ندوہ کو چھوڑ کر برِصغیر کے بیشتر علماء وادباء حریری کے مردہ وبوسیدہ اسلوب کے اسیر رہے۔ حریری کے اسلوبِ نگارش کو اس مردہ دلہن سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو غازہ وکاجل اور زر وجواہر کے زیورات سے آراستہ وپیراستہ کردیا جائے۔

غامدی صاحب کی عربی نثر: اغلاط کی نشان دہی:

ص ۳۵: شرح شواھد لفراھی (ا) چھ چھوٹے صفحات کے اس مختصر مضمون میں (سطر ۵) وہ لکھتے ہیں: ''اذا أراد ان یبلغ ما تحتوی کتبه هذا'' یہاں ''تحتوی'' کے بجائے تحوی بہتر ہوتا کہ اگر چہ تحتوی بھی اس معنی میں آتا ہے، لیکن عصرِ حاضر کے فصحاء زیادہ تر ''تحوی'' استعمال کرتے ہیں، اور اگر تحتوی لکھنا تھا تو اس کے لیے صلہ ''علی''، ضروری تھا، عصری عربی زبان میں ایسا ہی ہے۔ یہاں ''یبلغ بھی کوئی اچھی عربی نہیں، یدرک یا یستوعب بہتر ہوتا، الباحث المستهدی (اسی سطر میں) بوسیدہ عربی کی مثال ہے، ہونا چاہیے ''الباحث المستطلع''۔

غامدی صاحب: فاحش نحوی غلطی

اس کے فوراً بعد دوسری سطر میں ایک فاحش نحوی غلطی ہے کہ موصوف نے ''بــوادٍ قــفــرٍ ذو عقبات'' لکھا ہے ایک عام عربی داں جانتا ہے کہ یہاں ''ذو عقبات''، نہیں بلکہ ''ذی عقبات'' ہونا چاہیے کہ اس سے قبل موصوف یعنی ''وادٍ'' مجرور ہے۔ اس کے بعد ''ضفاف'' بھی غیر فصیح ہے، ضفاف (کنارا) نہر کے کنارے کے لیے عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ لغت کی کتابوں میں ''ضفاف'' بھی وادی کے کنارے کے لیے مل جائے گا، لیکن پہلے تو یہ بات کہ کسی زبان میں بھی نثر یا نظم لغت کی کتابیں دیکھ کر نہیں لکھی جاتی ہے، اور دوسرے یہ کہ وادی یعنی ''مسیل الماء'' جب پانی سے بھری ہو تو ضفاف کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے، ورنہ ''حافة الوادی''، مستعمل ہے۔ اس کے بعد کی دو سطروں میں حقاف و تلاع بھی غیر مانوس وغیر مستعمل الفاظ ہیں، الرمال و التلال زیادہ مناسب ہوسکتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنی لغوی مہارت کا اظہار کرنا چاہتا ہے اور اس کوشش میں وہ روانی تحریر سے محروم ہوگیا ہے اور یہ لفظ ''خبوت'' تو مصنف کے احساس کمتری کی بہت واضح مثال ہے۔ ''خبوت''، فعل خَبتَ سے ہے یعنی کشادہ و پست زمین۔ یہ لفظ متروک ہے، حتی کہ مشہور و مستند لغوی جوھری نے بھی اپنی صحاح میں اس مادہ (خ ب ت ن) کے تحت صرف اخبات یعنی خشوع اور عاجزی وزاری کا لفظ دیا ہے، ''اعــمــق الأغــوار'' موزوں ومقبول ہوتا۔ عربی زبان میں ''اِخبات'' ہی کا استعمال زیادہ ہے، اور یہی قرآن میں آیا ہے۔

غیر مانوس، غیر فصیح، مضحکہ خیز اور غلط نثر

''اکثر ماتحجب'' بھی غیر مانوس ہے، ''کثیرا ماتحجب'' ہونا چاہیے، اس کے بالمقابل قلیلاما ہے۔ قرآن میں ''قیلاً ماتؤ منون''۔

''فیغوص علیه''، غلط ہے، یغوص (غوطہ لگانا) کا صلہ ''فی'' ہے، یغوص فیه ہونا چاہیے۔ یغوص علیہ کا مفہوم ہوگا: اس کے اوپر غوطہ لگاتا ہے، جو بداھۃً غلط ہے، جب کہ یــغــوص فیــه کے معنی ہوں

گے، اس میں یا اس کے اندر غوطہ لگا تا ہے۔

مستوی الرجاء بھی درست نہیں، **مستوی الأمل** ہونا چاہیے، عربی ادب کا ذوق رکھنے والے دونوں الفاظ کے موقع ومحل کا فرق جان سکتے ہیں۔

"**منتقلاً من بطن الی بطن**" غیر فصیح بلکہ مضحکہ خیز ہے، شاید مقصود "**بطن الوادی**" ہے، ویسے بطن قبیلے کی ایک شاخ کا نام بھی ہوتا ہے، لیکن ظاہر و عام معنی پیٹ کے ہیں۔ ہونا چاہیے: **من وادٍ الی واد**۔

رکیک، بے ربط پر تصنع اور مُہمل عربی نثر

قام شعوری ذاک خطیباً: متصنع اور مہمل ہے، اور بعد کی دوسطروں میں **جاور الفوز، اقوم الی العزم اعقده بالثقة، فنهضت الی اقلامی**، مہمل، رکیک اور تصنع و عجمۃ سے بھرپور جملے ہیں۔ کیا ایک قلم لکھنے کے لیے کافی نہ تھا کہ مصنف صاحب نے بہت سے قلم اٹھائے؟

ص۲۶: **الشاعر المشهور الاسلامی** غلط ہے، صحیح **الشاعر الاسلامی المشهور** ہے۔ "**استهلها یعجب من انکار خولة**" رکیک ہے، صحیح "**استهلها باستعجابه من انکار خولة**" ہوگا۔ پھر **اذطعن فی السن** اور **ثم اذجرّبه الکلام** بھی رکیک جملے ہیں، اور مفہوم مبہم ہے، صحیح ہوگا: "**لکونه طعن فی السن**" اور "**ثم جرّبه الکلام**" .... "**وشبه الناقة**" بھی بے ربطی عبارت کی خبر دیتا ہے، **تشبیهه الناقة بالحمار** ہونا چاہیے، یا پھر جملہ یوں ہوگا **وحیث جرّبه الکلام الی** ....

غامدی صاحب: املاء کے اصولوں سے ناواقف

ووصف ناقته شبه الناقة بحمار الوحش" اس طرح شبہ سے پہلے کاما (،) غلط ہے۔

الکلاء، غلط املاء ہے صحیح "**الکلأ**" ہے۔

عن ابناء هم غلط املاء ہے، ہمزہ جب حالت جر میں ہوتا ہے تو ایک شوشے پر لکھا جاتا ہے **ابنائهم** اور حالت رفع میں (واوَ) ہوا اور حالت نصب میں تنہا لکھا جاتا ہے، مختلف مقامات سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف کو ہمزہ کے املاء کے یہ قواعد معلوم نہیں۔

خیومة جرم (ج پر فتحہ اور راء پر سکون: ایک چھوٹے قبیلے کا نام) **خیومة** معاجم اللغة میں تو ضرور آیا ہے جو **خام یخیم خیماً و خیمانا** کے ساتھ اس فعل کا ایک مصدر ہے لیکن اِس کا استعمال غیر فصیح ہے، بلکہ اِس موقع کے لیے فصیح لفظ نکوص یا جبن (فرار، بزدلی) ہے، یہ لغت دانی کا بے جا استعمال ہے۔ **خیومة رجل** یا **خیومة قوم** کوئی فصیح عرب لکھتا نہیں ہے۔

قدیم الفاظ واشعار یاد کرنا اور اُگلنا زبان دانی نہیں

حیرت کا مقام ہے کہ مضمون نگار صاحب کو قدیم شاعر مرار بن منقذ کے جاہلی انداز کے شعر کی شرح کرتے ہوئے حرف ''فی'' اور ''اعلیٰ'' جیسے عام الفاظ کی شرح بھی کرنا پڑی! انھوں نے اس موقعہ پر درحقیقت جاہلی دور کے اشعار کے اپنے حفظ کا مظاہرہ کیا ہے، قدیم اشعار کو یاد کر لینا اور ان کو اگلنا زبان دانی نہیں ہے۔

''المنصب کا لجذل'' صحیح یہاں منصوب ہے، جیسا کہ ظاہر ہے۔

فمعنى التروية''۔ صحیح ہے، فمعناه التروية. تروية اگر چہ لغت میں ہے، لیکن زیادہ مستعمل اور فصیح الروية اور التروی ہے۔

قسم فلان الأمر اذا فكربه، صحیح فكر فيه ہے۔

ص ۲۷۔ منتصباً في مكان اعلىٰ من هضبة مہمل ہے۔ صحیح ہے، 'منتصباً في اعلىٰ مكان من هضبة''

غامدی صاحب کا شوق تقعر: مہمل عربی تحریر

زهير بن ابی سلمىٰ (ذهیر غلط چھپا ہے) کے ایک شعر کی شرح میں مصنف نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں: الاجباب، فازعة، فاهوى لها ان سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف کو تقعر اور اظہار زبان دانی کا بہت شوق ہے، یا پھر یہ کہ وہ سلیس و رواں عربی لکھنے سے قاصر ہیں اور پھر اپنے اس شوق تقعر میں بڑی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اب یہاں وارد جملوں میں لفظ الاجباب (جمعُ جبّ) مہمل ہے، کیونکہ جُب ایسے کنویں کو کہتے ہیں جو بہت گہرا اور غیر تعمیر شدہ ہوتا ہے، یعنی کچا کنواں، عام مستعمل لفظ ''البئر'' (الآبار اس کی جمع) ہے، فازعة غلط ہے یہاں صحیح ''فَزِعة'' ہے، کیونکہ فازعة باب فزع یفزَع فزْعاً سے ہے، جس کے معنی بیزار ہونے اور نفرت کرنا ہیں، جو یہاں مقصود نہیں، بلکہ فاختہ کا ڈر کر اُڑ جانا مفہوم ہے، اور ڈرنے کے لیے یہ لفظ باب فزع یفَزع فَزعاً یعنی باب سمع سے ہے، اور اس سے صفۃ مشبہ (فاعل) فزِع ہے جس کا مؤنث فَزِعة ہے۔

اهوىٰ لها الصقر کی جگہ هوىٰ لها الصقر ہونا چاہیے، کیونکہ ھویٰ کے معنی گرنا جھپٹنا ہیں اور اُھویٰ کے معنی جعله يسقط الى اسفل (المعجم الوسیط) گرانا ہیں، اگر چہ قدیم معاجم اللغۃ میں اھویٰ اور ھویٰ ہم معنی لکھا ہے، لیکن فصیح ھویٰ ہی ہے، کیونکہ قرآن کریم میں یہی استعمال ہے، والنجم اذا هوىٰ (سورۃ النجم)

ص ۲۸: غلب الكلاب، غلب على الكلاب ہونا چاہیے۔

النبت، حیرت ہے کہ زھیر بن ابی سلمٰی کے شعر کی عربی زبان میں شرح لکھتے ہوئے مصنف کو **النبت** جیسے عام فہم لفظ کی شرح کرنا ضروری معلوم ہوا!

غامدی صاحب کی عربی نثر: دو فاحش اغلاط

ص۲۹: **الضاحی** کی شرح میں فرمانا **لاتظله شئی** اس میں دو فاحش اغلاط ہیں، ایک تو یہ کہ شئی مذکر ہے، اس کا فعل بھی مذکر ہونا چاہیے، پھر یہ کہ یہاں مطلوب ظل سے ''**یظلله**'' ہے، یُظلّہ نہیں۔

الاغدرة و الحیضان، مصنف کے تقعر وتعالم کی ایک اور مثال ہے، غدیر وحوض کی معروف جموع غدران واحواض چھوڑ کر یہ غیر معروف جمعیں لکھی ہیں۔

الحباک والجیکة للطریقه التی توجد فی الثوب المنسوج...... غلط اور غیر مفہوم ہے، **الخطوط** ہونا چاہیے۔ اس شعر میں پانی کی رعایت سے۔

عبارت گنجلک، شرح ومعنی خلاف واقعہ اور مضحکہ خیز

زھیر بن ابی سلمٰی (جاہلی شاعر) کے شعر کی شرح کے آخر میں موصوف فرماتے ہیں ''(**الشاھد فیه) ان الحبک قدا ستعمل فی قوله تعالی: و السماء ذات الحُبک اللطرائق التی توجد فی قطع السحاب المتجعد الشتوی المراد بالسماء**۔

عبارت میں گنجلک ہے، مصنف سے بات سیدھے طریقے سے نہیں لکھی گئی، ہونا یوں چاہیے: **ان الحُبک قدا ستعمل فی** .... **بمعنی الطرائق**...... پھر یہ کہ غامدی صاحب نے **السحاب** کی صفت **المتجعد** بتائی ہے۔ جو خلافِ واقعہ اور مضحکہ خیز ہے، جعودۃ اور تجّعد بالوں کے گھنگریالے پن کو کہتے ہیں۔ بادلوں میں بالوں کی طرح کا کوئی گھنگریالا پن نہیں ہوتا، البتہ آسمان میں تاروں کی جو ٹیڑھی سیدھی ترتیب ہے وہ، یا کہکشاؤں میں جو پیچیدگی نظر آتی ہے، اس کو بالوں کے تجعد سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے۔ اسی لیے لسان العرب میں **الحبک** کے معنی **طرائق النجوم** دیے ہیں۔ پھر اس تجعد کو **السحاب الشتوی** (موسم سرما کے بادل) میں غامدی صاحب نے کہاں ملاحظہ فرمایا ہے؟ اور کیا **السحاب الصیفی** میں یہ تجعد نہیں ہوتا؟

مصنف کی یہ ساری شرح قرآن کے مصداق ''**ظلمات بعضها فوق بعض**'' (النور) ہے۔ درحقیقت **حُبُک** کے ایک معنی بال کا گھنگریالا پن بھی ہے، امام طبریؒ نے جہاں حبک کے دیگر معانی لکھے ہیں، وہاں یہ بھی لکھا ہے: **یقال لتکسیر الشعرة الجعدة: حبک**''۔

آیت قرآنی ''**والسماء ذات الحبکُ**'' کی جو تفسیر ہمارے قدیم عرب مفسرین امام طبریؒ، زمخشری قرطبی اور ابن کثیر وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ اور الحسن البصری کے حوالے سے فرمائی ہے،

یعنی ''طرائق النجوم الحسنة'' جن سے آسمان رات کو مزیّن دکھائی دیتا ہے، وہی صحیح ہے اور یہ تشریح اس اصول تفسیر ''القرآن یفسّر بعضه بعضاً (قرآن کے کچھ حصّوں کی قرآن کی دوسرے حصّے تفسیر کرتے ہیں) کے عین مطابق ہے۔قرآن میں ہے: ولقد زینا السماء الدنیا بمصا بیح (الملک: آیت ۵) ایک دوسری آیت میں ہے: افلم ینظر وا الی السماء فوقهم کیف بنینٰا هاً وزینٰهاً (ق: آیت ۲)انا زیّنا السماء الدنیا بزینة ن الکوا کب (الصفت:۶)

اور اس کی تائید معاجم اللغۃ اور خاص طور سے لسان العرب سے بھی ہوتی ہے، جس میں حبک السماء کے معنی طرائق اور والسماء ذات الحبک کے معنی طرائق النجوم دیے گئے ہیں، السحاب یا السحاب المتجعد (بادلوں) کا کہیں ذکر نہیں۔اس ضمن میں اس طرف اشارہ کردوں کہ میرے ذہن میں اس جملۂ قرآنی کی تفسیر میں کہکشاؤں کی بات آئی تھی، اتفاق کی بات کہ یہی تفسیر طبری کے عظیم محقق اور مشہور مصری ماہر لغت شیخ محمود احمد شاکر نے بھی اس موقعہ پر اپنے تفسیری نوٹ میں لکھی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''والسماء ذات الحبک'': هی طرائق الضوء، تری فی السماء فی غیاب القمر وهی ماتسمی بالمَجرة'' المَجَرّة عربی میں اور انگریزی میں milky way کو کہتے ہیں۔ بلکہ یہ معنی ہم سب سے قبل امام قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں تحریر کیے ہیں۔ان کے دیے ہوئے سات معانی میں سے ایک یہ بھی ہے۔ذات الحبک کے مفسرین اور اہلِ لغت نے دوسرے معانی بھی ذکر کیے ہیں، جو حسن تخلیق، متانت، زینت وغیرہ ہیں، اور ان کی تائید دوسری آیات قرآنی سے ہوتی ہے، ویسے عربی میں ''حبک'' کے ایک معنی ہی سخت بندش کے ہیں، اس لیے ہاتھ پاؤں کا فطری طور پر جو مضبوط گھوڑا ہوتا ہے۔ اس کو ''محبوک'' کہتے ہیں، امرؤالقیس کا شعر ہے:

قد غدا یحملنی فی انفه　　　　لاحق الأیطل محبوک ممر

یہاں انف تیز رفتاری کے معنی میں ہے۔(لسان العرب)

فراہی صاحب وغامدی صاحب نے ''زهیر'' کا مصرعہ غلط لکھا ہے:

جاوید غامدی صاحب کے استاد کے استاد فراہی صاحب نے تو اس آیت قرآنی کی تفسیر کے لیے صرف ایک ہی جاہلی شعر لکھا ہے، لیکن اگر وہ تفسیر طبری، تفسیر زمخشری، تفسیر قرطبی وغیرہ دیکھیں گے تو انھیں ''حُبک'' کی تفسیر میں دوسرے جاہلی اشعار بھی نظر آئیں گے۔اسی لیے یہ صرف انہی کا کارنامہ نہیں ہے کہ تفسیر قرآن کے لیے انھوں نے جاہلی اشعار کو بنیاد بنایا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ ہمارے یہ قدیم مفسرین صحابہ وتابعین کی تفاسیر کو پہلے ذکر کرتے اور ان پر اعتماد کرتے ہیں، اور بعد میں جاہلی اشعار پر۔ پھر یہ کہ

انھوں نے زہیر کا یہ شعر بھی غلط لکھا ہے، موصوف نے جو شعر اپنے مضمون میں پیش کیا ہے اس کا پہلا مصرع یوں لکھا ہے:

''مکلل باصول النبت تنسجه'' لیکن یہ مصرع تفسیر زمخشری، تفسیر قرطبی اور تفسیر اضواء البیان للشیخ محمد امین الشنقیطی میں: ''مکلل باصول النجم تنسجه'' ہے۔

دوسری صدی ہجری کے مشہور ماہر لغت اور مفسر قرآن ابوعبیدۃ معمر بن المثنّٰی نے اپنی کتاب مجاز القرآن میں بھی النبت کی جگہ النجم لکھا ہے اور یہی جاہلی اسلوب شعر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے، النجم کے ایک غیر معروف معنی نبت یا نباتات کے بھی ہیں۔ بلکہ شاید مرحوم فراہی صاحب نے بھی یہاں ''النجم'' ہی لکھا ہوگا، جبھی غامدی صاحب نے اس لفظ کی تشریح زمین میں اُگنے والی مختلف نباتات سے کی ہے، جس پر میں نے اپنی حیرت کا بھی سابقہ صفحات میں اظہار کیا اور خیال کیا کہ موصوف نے اپنے مضمون شرح شواهد الفراهی میں غلط نقل کر دیا ہے۔ مولانا فراہی سے میرا یہ حسن ظن بعد میں اُن کی تفسیر سورۃ والذاریات دیکھنے پر غلط ثابت ہوا، اُنھوں نے بھی یہاں ''اصول النبت'' ہی لکھا ہے، جو غلط ہے۔

غامدی صاحب کا غُرورِ علم: تضحیک اکابرین

غامدی صاحب نے اپنے غرور علم (جس کی حقیقت واضح ہو چکی ہے اور مزید ظاہر ہوگی) میں ایک ایسا جملہ لکھ دیا ہے جس سے ہمارے اسلاف (صحابہ و تابعین) حضرت عبداللہؓ ابن عباس، حضرت حسن البصری، مجاہد، ضحاک وغیرہ کی تغلیط و تضحیک ہوتی ہے۔ موصوف فرماتے ہیں: **واما الذین قالوا ان المراد به نجوم السماء فانهم لم يتتبعوا كلام العرب حق التتبع ولم يتأملوا فيما يقتضي موقعه هنا، فلم يتبين لهم معناه، فاخطأوا وجه الصواب** (اور جن لوگوں نے کہا کہ اس سے مراد آسمان کے ستارے ہیں تو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے کلام عرب کی اچھی طرح چھان بین نہیں کی اور نہ اس پر غور کیا کہ یہاں کس بات کا موقع و محل ہے، اس لیے انھیں اس (ذات الحبک) کے معنی سمجھ میں نہیں آئے اور وہ غلطی کے مرتکب ہوئے)۔

غامدی صاحب عربی کے چند جملے صحیح نہیں لکھ سکتے مگر امت کے اکابرین پر حملہ آور ہیں:

معاذ اللہ! آپ کو معلوم ہے کہ اس انسان نے جو عربی کے چند جملے بھی صحیح نہیں لکھ سکتا کس پر حملہ کیا ہے، امام حسن البصری و سعید بن جبیر جیسے تابعین اور طبری و زمخشری جیسے ادیب و ماہر لغت و مفسر قرآن پر (ملاحظہ ہو، اس آیتِ قرآنی کی تفسیر طبری اور زمخشری میں)، یہ وہ غرور علم ہے جو موصوف کو امین احسن اصلاحی مرحوم اور ان کو حمیدالدین فراہی صاحب سے ورثہ میں ملا تھا، اِس ''لُغویّت'' اور غرور کا اندازہ اِس بات سے ہوتا ہے کہ امین احسن اصلاحی صاحب کی وفات پر موصوف نے لکھا تھا کہ وہ بیسویں صدی کے امام

تفسیر تھے، حالانکہ ان کی تفسیر ''تدبر قرآن'' میں نہ تو کوئی غیر معمولی تحقیق واستیعاب ہے اور نہ اس کو برصغیر میں وہ مقبولیت حاصل ہے جو مولانا مودودیؒ کی ''تفہیم القرآن'' کی ہے۔ اس انتہائی مبالغہ آمیز بیان سے تو جو حقیقت کے بالکل برعکس ہے مولانا فراہی کی تنقیص ہوتی ہے جن کے شعری شواہد کی وہ شرح لکھنے بیٹھے ہیں۔ مولانا فراہیؒ کے تفردات سے جتنا بھی اختلاف کیا جائے بہرحال وہ عربی داں اور مفسر قرآن تھے۔ عربی زبان میں صاحب تصانیف تھے۔ اصلاحی صاحب اس پایہ کے نہ تھے۔ السید رشید رضا المصری، مولانا مودودی، سید قطب اس صدی کے نامور ترین اور مقبول ترین مفسر تھے۔

غامدی صاحب کا سرقہ

جاوید غامدی صاحب نے بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ انھوں نے آیت ''**والسماء ذات الحبک**'' کی شاذ تفسیر اپنے استاد کے استاد مولانا حمید الدین فراہی مرحوم کی تفسیر سورۂ ''والذاریات'' سے چرائی ہے۔ (ملاحظہ ہو مجموعۂ تفاسیر فراہی، ص۱۵۲) صرف اتنا ہے کہ انھوں نے ان جمہور مفسرین کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے جنھوں نے آیت بالا میں ''السماء'' کے معروف ومتداول آسمان معنی لیے ہیں اور **ذات الحبک** کے یعنی ستاروں کی لائنیں یا **المجرّة** [Milky way] مراد لیے ہیں، ان کے لیے صرف اتنا کہا تھا کہ ''ہمارے نزدیک ان کی رائے صحیح نہیں ہے''۔ (حوالۂ بالا)

غامدی صاحب نے اپنے استاد الاستاد سے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے ان کی تجہیل وتغلیط ان الفاظ میں کی: **فانهم لم يتتبعوا كلام العرب حق التتبع، ولم يتأملوا فيما يقتضى موقعه هنا، فلم يتبين لهم معناه، فاخطاؤا وجه الصواب**'' (کہ ان لوگوں نے کلامِ عرب میں پوری طرح جستجو نہیں کی، اور نہ اس پر غور کیا کہ یہاں اقتضائے محل کیا ہے اس لیے وہ صحیح معنی نہ پا سکے)۔

میں مزید عرض کروں گا کہ اس آیت قرآنی میں **السماء** سے بادل مراد لینا مولانا فراہیؒ کی کوئی اُپج نہیں ہے، بلکہ قرطبی نے اپنی تفسیر میں یہ معنی صیغہ تمریض (یعنی شک) ''قیل'' کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مولانا فراہی نے یہاں السماء کے معنی السحاب (بادل) اس لیے اختیار کیے ہیں جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے (حوالۂ بالا)، کہ سورۂ **والذاریات** کی ابتدائی چار آیات تمام کی تمام ہواؤں اور ان کی مختلف کیفیات و احوال کے لیے ہیں، جب کہ حضرت علیؓ سے منقول کردہ روایت میں ان چاروں آیات کے معانی مختلف ہیں، **الذاريات**: ہوائیں، **الحاملات وقراً**: بادل، **فالجاريات يسراً**: کشتیاں **فالمقسمات امراً**: الملائکۃ۔ اب بتایا جائے کہ حضرت علیؓ سے بڑھ کر قرآن اور عربی زبان کا سمجھنے والا کون ہوسکتا ہے جب کہ انھوں نے یہ تفسیر پوچھنے والوں کو منبر پر کھڑے ہوکر اپنے اس دعویٰ کے ساتھ بتائی تھی: **لایسأ لنی احد عن آية من كتاب الله الا اخبرته** (جو کوئی بھی مجھ سے قرآن کی کسی آیت کے بارے میں پوچھے

گا میں اس کو بتا سکتا ہوں، تو عبداللہ بن الکواء نے ان آیاتِ بالا کے معانی آپ سے پوچھے اور حضرت علیؓ نے یہ معانی بتائے (تفسیر طبری، تفسیر آیات مذکورہ) اور یہی تفسیر اِن آیات کی حضرت عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ کے شاگرد اور مشہور تابعی و مفسر قرآن مجاہدؒ سے بھی تفسیر طبری میں اسی مقام پر منقول ہے۔ **فالحاملات وقراًo فالمقسمات أمراً** کے مذکورہ معانی حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہیں۔

فراہی صاحب کی تفسیر ماہرین لغت کے برعکس

ان آیات اور خاص طور پر چوتھی آیت "**فالمقسمات امراً**" پر ہم بعد میں گفتگو کریں گے۔ یہاں "**والسماء ذات الحبک**" کے ضمن میں مولانا فراہی کی تفسیر معرض گفتگو میں آ گئی، انھوں نے سورۂ "الذاریات" کی ان چار آیات کو مختلف ہواؤں کے معنی میں لیا ہے، اپنے مخصوص نظریۂ نظر قرآن کی بنیاد پر ہواؤں کی مناسبت سے انھوں نے "**ذات الحبک**" کے معنی بادلوں والا آسمان لیا ہے، لیکن ان کی یہ تفسیر ایک طرف تو جمہور مفسرین، طبری، زمخشریؒ، رازیؒ ابن کثیرؒ اور قرطبیؒ وغیرہ کے خلاف ہے اور دوسری طرف ماہرینِ لغت صاحبِ لسان العرب، صاحبِ قاموس اور صاحب المفردات فی غریب القرآن وغیرہم کے بھی خلاف ہے، بلکہ راغب اصفہانی نے تو المفردات میں اس کے معنی صفائی کے ساتھ "**ذات الطرائق المحسوسة بالنجوم و المجرة**" (ستاروں اور کہکشاں کے محسوس راستوں والا آسمان) دیے ہیں۔

ماہرِلُغت ابوعبیدہ صاحب مجاز القرآن کا استدلال

مزید برآں یہ کہ دوسری صدی ہجری کے مشہور مصنف مفسر اور ماہر لغت ابوعبیدۃ بن معمر ابن المثنی نے اپنی کتاب مجاز القرآن میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے زھیر بن ابی سلمٰی کے اس شعر کے جس سے مولانا فراہی نے "حُبک" کے معنی بادلوں کی تہیں مراد لیے ہیں بالکل دوسرے معنی بتائے ہیں، اس نے حبک کے معنی "**طرائق الماء**" (پانی میں ہوا کے اثر سے پڑنے والی لہریں) لکھ کر استدلال میں زھیر کا وہی شعر:

مکلل باصول النجم تنسجه ریح حریق لضاحی مائه حُبُک

پیش کیا ہے۔ لہٰذا فراہی صاحب اور ان کے تتبع میں غامدی صاحب کا اس شعر سے اپنے مزعوم معنی (بادلوں کی تہوں یا گالوں) پر استدلال کرنا سراسر غلط ہے، زھیر کے شعر کے یہ معنی بہت واضح ہیں۔

پھر یہ کہ جب جناب غامدی کے مطابق زھیر اس شعر میں پانی کا وصف بیان کر رہا ہے۔ **فاخذ یصف الماء** (صفحہ ۳۸) تو پھر انھوں نے اس کا اطلاق بادلوں پر کیسے کرنا شروع کر دیا؟ وہ دوسری سطر میں (اللغۃ) کے تحت لکھتے ہیں: "**المکلل الذی احدق به من جوانبه کلها ولذا استعمل صفة لضمام محفوف بقطع من السحاب**"۔ المکلل کی یہ بڑی عجیب اور مضحکہ خیز تشریح ہے، غمام تو خود ہی

سحاب (یعنی بادل) کو کہتے ہیں۔ پھر بادل کا بادل سے محفوف (گھرا ہونا) مہمل بات ہے، صحیح وہ ہے جو مصری علامہ عبدالسلام ہارون نے اپنی کتاب ''شرح القصائد السبع الطوال'' میں لکھا ہے کہ یہاں سحاب سے مراد وہ بادل ہے جس پر بجلی کا تاج ہو، اور بجلی بادل کے لیے ایسی ہے جیسے تاج۔ ابو عبیدۃ معمر بن المثنی (وفات ۲۱۰ھ) کے اس قول کے بعد جو اوپر پیش کیا گیا کہ زہیر بن ابی سلمی کا شعر:

مکلل باصول النجم تنسج ریح خریق لضاحی مائه حبک

پانی کے وصف میں ہے جس میں آبی پودے تاج کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ غامدی صاحب کے ممدوح مولانا فراہی صاحب کا یہ قول نادرست ٹھہرتا ہے کہ یہ شعر بادلوں کے وصف میں ہے، اور خود غامدی صاحب کی اس شعر کی لمبی چوڑی تشریح کار عبث ہے، ان کی داخلی نحوی اور لغوی غلطیاں تو علیحدہ بات ہے جن کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

الذاریات میں ستاروں کے ذکر کی حکمت

ایک اہم بات آیت کی تفسیر کے ضمن میں یہ ہے کہ اس آیت میں قسم کے بعد مقسم علیہ یعنی جس چیز کے لیے قسم کھائی گئی ہے اس پر غور کرنا ضروری ہے جس سے ہمیں مقسم بہ (یعنی جس کی قسم کھا گئی ہے) کا تعین کرنا آسان ہو جائے گا۔ قسم اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کھائی گئی ہے کہ قیامت کے بارے میں تمھارے افکار پراگندہ ہیں: **والسماء ذات الحبک o انکم لفی قول مختلف** ۔ستاروں سے مزین آسمان اس کا گواہ ہے کہ تمہاری (قیامت کے بارے میں) باتیں بڑی مختلف ہیں۔ اس سے قبل کفار کے قیامت اور جزا و سزا کے انکار کی تردید کرتے ہوئے یہ بات کہہ دی گئی تھی کہ: وقوع حشر و نشر کا جو وعدہ تم سے کیا جا رہا ہے وہ سچ ہے، اور سزا و جزا یقیناً وقوع پذیر ہوں گی۔ **ان ماتوعدون لصادق. وان الدین لواقع.** (الذارایت: ۵۔۶) لیکن کفار قیامت اور سزا و جزا کا صرف انکار ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس بارے میں وہ بڑی مختلف اور اٹکل پچو باتیں کرتے تھے، کبھی کہتے تھے کہ قیامت ہوگی تو ہم ہی وہاں سرفراز ہوں گے کیونکہ ہم دنیا میں مال و دولت سے سرفراز ہیں، کبھی یہ کہتے تھے کہ اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ حشر و نشر اور جزا و سزا کب ہوگی؟ **والسماء ذات الحبک** کی قسم کے بعد چار چھوٹی چھوٹی آیتوں میں ان کے ان مختلف اقوال اور کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے۔

اب اس مناسبت سے گواہ ایسی چیز ہی کو بنانا چاہیے جس میں اختلاف اور پراگندگی پائی جاتی ہو اور وہ چیز آسمان ہے جس میں ستارے بے ترتیبی کے ساتھ بکھرے ہوئے ہیں، ایسے ہی قیامت کے بارے میں ان کی باتیں بکھری ہوئی اور پراگندہ ہیں، جب کہ ان کی پراگندہ باتوں سے بادلوں کی کوئی مناسبت نہیں۔ جب سورج روشن ہو تو بادل روئی کے گالوں کی شکل میں نظر آتے ہیں، اور جب بادل گہرا اور گھٹا ٹوپ

ہوتو وہ صرف ایک بہت بڑا سیاہ پردہ ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ بادل بھی علیحدہ علیحدہ ٹکڑوں میں ہوتے ہیں، لیکن بادل اس طرح بکھرے ہوئے نظر نہیں آتے ستارے نظر آتے ہیں، پھر یہ کہ ستارے کچھ چھوٹے کچھ بڑے، کچھ بہت زیادہ چمکدار اور کچھ کم، کچھ بہت دور معلوم ہوتے ہیں اور کچھ قریب، جبکہ بادلوں کی یہ صفت نہیں، مزید یہ کہ وہ ہر موسم میں ہر وقت نہیں ہوتے۔ اس طرح جو اختلاف ستاروں میں نظر آتا ہے وہ بادلوں میں نہیں۔ اس لیے ''**إنكم لفي قول مختلف**'' کی مناسبت سے **ذات الحُبُک** کا ترجمہ ذات النجوم ہی زیادہ صحیح ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جو جمہور مفسّرین سے منقول ہے۔

اس سے قبل غامدی صاحب نے جس شعر کی تشریح فرمائی ہے، وہ فراہی صاحب کی اسی سورۂ ''الذاریات'' کی آیت چار کی تفسیر کے ضمن میں وارد ہوا ہے۔ افسوس کہ جاوید غامدی صاحب نے شرح شواہد الفراہی میں اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے یہ نہیں بتایا کہ یہ شعر مولانا فراہی مرحوم نے آیت **فالمقسمٰتِ أمرا** کی تفسیر کے ضمن میں پیش کیا تھا، لیکن اس ساری تشریح کے آخر میں انھوں نے **(الشاهدفيه)** کے تحت لکھا ہے کہ شعر زیر بحث:

ظلّ في اعلىٰ يفاع جاذلا　　　يقسم الامر كقسم المؤتمر

میں ''**القسم معناه التقدير والتروية......والتقسيم منه بالمبالغة والتكثير كمافي قوله تعالىٰ: فالمقسمٰت امرا**''۔

اگر موصوف ابتداء ہی میں یہ فرمادیتے کہ یہ شعر مذکورہ آیت کے مزعوم معنی کے استدلال کے لیے فراہی صاحب نے پیش کیا ہے، تو پھر اس پر دوسرے انداز سے بحث ہوتی، اور بتایا جاتا کہ دوسرے مفسرین اور اہل لغت کے نزدیک ''المقسمٰت امراً'' کے کیا معنی ہیں۔ بہر حال اس بات کی وضاحت چونکہ ''والسماء ذات الحبک'' میں لفظ ''حُبُک'' کی تشریح کے وقت ہوئی اس لئے خود فراہی صاحب کی اس تفسیر پر بحث ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسی تفسیر کی صحت کے لیے یہ شعر پیش کیا گیا ہے۔

مولانا فراہی کی زبان دانی اور شعر فہمی صحابہ کبار سے زیادہ نہیں

حقیقت یہ ہے کہ مولانا فراہی مرحوم کی زبان دانی، شعر فہمی اور تدبر قرآن کے سلسلے میں ان کا نقطۂ انطلاق (Starting Point) جمہور مفسرین اور درایت کے خلاف ہے جمہور مفسرین کے نزدیک جس کی عقل بھی متقاضی ہے تفسیر قرآن کے لئے اس ذات گرامی کی تفسیر کی طرف رجوع ضروری ہے جس پر قرآن نازل ہوا تھا اور اس کے بعد اُن صحابۂ کرام کی تفسیر کی طرف جو صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلیم قرآن حاصل کرچکے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے فیض یاب تھے اور جاہلی عربوں کے ذخیرۂ شعر سے بھی واقف تھے، کیونکہ وہ اس شعری ذخیرے سے قریب العہد تھے، اور سلیقۂ زبان ان کو ان

عجمی زبان دانوں اور مفسرین سے بہت زیادہ تھا جو صدیوں بعد آئے۔ اور صحابۂ کرام کے بعد وہ تابعین ہیں جو ان فقہائے صحابہ عبداللہؓ بن مسعود، عبداللہؓ بن عباسؓ اور ابیؓ بن کعب وغیرہ کے شاگرد تھے۔

قدماء کا کلام جاہلیت سے استدلال کا طریقہ

اسی اصول پر ہمارے قدیم ترین صاحب تفسیر امام محمد بن جریر طبریؒ (م ۳۱۰ھ) نے اپنی ضخیم تفسیر لکھی جسے تفسیر بالروایۃ کا نام دیا گیا، اس کو بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی اور ہے اور پھر تقریباً چار سو سال بعد اس ضخیم تفسیر کی تلخیص و تنقیح (تنقیح صرف احادیث پر کلام کی حیثیت سے) حافظِ حدیث ابنِ کثیرؒ نے آٹھویں صدی ہجری میں کی جو اپنے اختصار (۴ جلدیں) کی وجہ سے زیادہ مقبول ومتداول ہے، یہاں یہ ملحوظ رہے کہ یہ دونوں مفسرین اور خاص طور پر امام طبری زبان دانی میں کسی ماہر لغت سے کم نہ تھے، ان کی تفسیر میں جہاں ارشادات نبوی اور اقوالِ صحابہؓ و تابعینؒ سے استناد ہے وہیں شعری استناد بھی ہے، حافظ ابن کثیر نے اختصار کی خاطر اپنی تفسیر میں بہت سے اشعار حذف کر دیے، یہی ایک تیسری مشہور و متداول ضخیم تفسیر امام قرطبی اندلسی (م ۶۷۱ھ) کی تفسیر کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اپنی تفسیر میں احکام القرآن پر خصوصی توجہ رکھنے (اس کا نام الجامع الاحکام القرآن ہے) کے باوجود بہت سے مقامات پر شعری ذخیرے سے استناد کیا ہے لیکن اولیت ان کے یہاں بھی اقوال صحابہؓ و تابعینؒ کو حاصل ہے اس کے ساتھ ہی ان مفسرین ماہرین لغت ونحو: فرّاء ابوعبیدۃ معمر بن المثنیٰ، ابن الاعرابی اور الزجاج وغیرہ کے اقوال کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔

یہ ایک اصولی بات ہے جس کا فراہی صاحب مرحوم کے یہاں فقدان ہے غالبًا اسی سبب سے ان کی چند سورتوں کی تفاسیر کو طبقۂ علماء میں قبولیت کی نظر سے نہیں دیکھا گیا اور نتیجۃً اس کو قبول عام حاصل نہیں ہوا۔

فراہیؒ مکتب فکر کا مسئلہ: الفاظ کے شاذ معانی اختیار کرنا

ایک دوسری اصولی بات کا فقدان ان کی ان تفاسیر میں یہ نظر آتا ہے کہ وہ الفاظ قرآن کے متداول معانی کے بجائے ان کے غیر معروف وشاذ معانی اختیار کرتے ہیں، اور اس کے لیے ان کو اشعار عرب سے استناد پیش کرنا پڑتا ہے۔ جس میں بعض اوقات بہت تکلّف نظر آتا ہے۔ سورۃ الذاریات کی مذکورۂ بالا دو آیات کے کے سلسلے میں بھی یہی دونوں باتیں نظر آتی ہیں۔ آیت نمبر (۷) پر تو ہم ان کی تفسیر پر کلام کر چکے ہیں، اور اب آیت نمبر: ۴ یعنی ''فالمقسمٰت امراً'' کے بارے میں عرض ہے کہ مرحوم نے اس آیت کا ترجمہ لکھا ہے (یا یوں کہا جائے کہ امین احسن اصلاحی مرحوم نے ان کی عربی عبارت کا اردو ترجمہ کیا ہے): ''پھر الگ الگ کرتی ہیں معاملے کو''۔ غالبًا ہر شخص اس سے اتفاق کرے گا کہ یہ جملہ خواہ عربی میں

ہو یا اردو میں خود ہی محتاج تفسیر ہے۔ سب سے بہتر ترجمہ وہ ہے جو حتی الامکان خود ہی تفسیر بھی ہو۔

تقسیم الامر اور قسم المؤتمر ہم معنی نہیں ہیں

اہلِ لغت اور قدماءِ مفسرین کے خلاف اس آیت کا مفہوم اختیار کرنے کے لیے فراہی مرحوم کو اموی عہد کے ایک شاعر کے ایک شعر کا سہارا لینا پڑا اور اس کے لیے انھیں دور از کار لغوی تاویلات کرنا پڑیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ قرآن میں تقسیم الامر کا لفظ ہے جبکہ پیش کردہ شعری شاہد میں قسم المؤتمر ہے، مولانا نے دونوں کو ہم معنی قرار دیا ہے حالانکہ اس کی تائید کتبِ لغت سے نہیں ہوتی۔ لسان العرب میں **قسم الامر قسماً** کے معنی تو وہی دیے ہیں جو شعر میں ہیں، لیکن التقسیم کے معنی التفریق کے دیے ہیں اور اِس کی تائید میں ابن منظور نے قِدر (ھانڈی) کے بارے میں یہ شعر بطور شاہد کے پیش کیا ہے۔

تُقسِّم ما فیھا، فان ھی قسَّمت فذاک وان أکرت فعن اھلھا تکری

اب اس شعر میں تقسِّیم اور قسمت کے معنی کسی معاملے میں فرق و امتیاز کرنے اور غور و فکر کے نہیں ہو سکتے بلکہ اس کے معنی تقسیم کرنا اور بانٹنا ہی ہو سکتے ہیں، جو قدیم و مستند ماہر لغت ابوعمرو بن العلاء (م ۱۵۴ھ) سے اسی جگہ لسان العرب میں منقول ہیں۔ مصنف (فراہی مرحوم) اور شارح کا یہاں یہ کہنا کہ قسم مبالغے کے لیے ہے جیسے کسر کا مبالغہ کسّر (بہت زیادہ توڑنا) درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ باب تفعیل ہمیشہ مبالغہ کے لیے نہیں آتا بلغ اور بلّغ، صدَق اور صدّق وغیرہ کی مثال سب کے سامنے ہے، باب تفعیل تعدیہ کے لیے بھی آتا ہے، اب بلغ کے معنی پہنچنا ہے جبکہ بلّغ کے معنی پہنچانا ہے اسی طرح صدق سچ کہنا اور صدّق کسی کو سچ ماننا ہے۔ پھر اسی موقعہ پر لسان العرب میں فلان جیّد القسم کے معنی جیّد الرأی (اچھی رائے رکھنے والا) دیے ہیں جبکہ رجل مقسَّم کے معنی دیے ہیں: مشترک الخواطر بالھموم (پریشانیوں کے باعث پراگندہ فکر)۔

المؤتمر کے معنی قرآن اور کلام جاہلیہ میں

پھر یہ کہ ائتمر جس سے شعر کا آخری لفظ المؤتمِر (ائتمر کا اسم فاعل، میم پر زیر) مشتق ہے، اس کے صرف وہی معنی نہیں جو مصنف نے اور اُن کے تتبع میں شارح غامدی صاحب نے دیے ہیں یعنی ''خود رائے'' (غالباً فراہی مرحوم نے عربی میں المستبد بالرأی لکھا تھا، جس کا ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن لغت میں ائتمار کے معنی صرف استبداد بالرأی نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک معنی ہیں اور غیر معروف ائتمار جس سے فعل ائتمر اور اسم فاعل مؤتمر (میم پر زیر) ہے اس کے معروف و متداول معنی باہم مشورہ کرنے کے ہیں۔ قرآن میں اسی معنی میں دو جگہ آیا ہے: **اِن الملأ یأتمرون بک لیقتلوک** (القصص:۲۰) اور دوسری جگہ **وائتمروا بینکم بمعروف** (الطلاق:۶) اور یہی معنی قدیم مخضرم (جاہلی اسلامی) شاعر النمر بن تولب کے شعر

میں ہے:

أری الـنـــاسَ قـداحـد ثـواشیـمة   وفـــی کـــل حـــادثة یــوتَــمـــر

اور یہی معنی امرؤالقیس کے شعر میں ہے:

احـــار بــن عــمـــر و کـأ نّــی خـمیــر   ویـعـدو عـلـی الـمـرء مـایأ تـمِـر (۱)

گدھا یا گورخر: مضحکہ خیز استدلال

ایک بڑی دلچسپ بات یہاں یہ ہے کہ کہ مرار بن منقذ کے پیش کردہ شعر میں مولانا فراہی کے مطابق ''گدھا گھانس کے مواقع کا جائزہ لے رہا ہے'' اور اس شعر کا جونثری ترجمہ انھوں دیا ہے وہ یہ ہے: ''وہ (گدھا) ٹیلے کی بلندی پر سر اٹھائے ہوئے ایک خودرائے کی طرح معاملے میں فرق وامتیاز کرتا رہا'' اور یہی بات غامدی صاحب نے لکھی ہے''ظـل الـحـمار ینظر فی امرہ و یفرق وجوھہ'' سوال یہ ہے کہ گدھے میں کب سے اتنی عقل آ گئی کہ وہ غور وفکر کرے اور معاملے کا جائزہ لے وہ بیچارہ تو اپنی بیوقوفی کے لیے ضرب المثل ہے۔ یہ بات دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز اس لیے ہوگئی کہ مصنف اور شارح دونوں نے حمار الواحش (گورخر) کے معنی قصباتی گدھے کے لیے ہیں، جاہلی عربی قصائد میں اکثر حمار الوحش یا صرف الحمار کے شکار کا ذکر قصیدے کی ابتدا میں ہوتا ہے، اس سے مراد گورخر [Zebra] ہی ہوتا ہے۔

مکتب فراہی اقوال صحابہ کرام اور تابعین پر اعتماد نہیں کرتا

تفسیر میں سند اقوال صحابہ یا کلام جاہلی

''الـمقِّسمٰت امراً'' کی تفسیر میں یہ تو رہی بات لغت کی جس پر مولانا فراہی اور غامدی بہت اعتبار کرتے ہیں، لیکن ان مفسّرین کے یہاں جو اقوال صحابہؓ وتابعینؒ پر اعتماد کرتے ہیں، جیسے طبریؒ، قرطبیؒ، ابن کثیرؒ وغیرہ ان کے یہاں اِس دولفظی آیت کی تفسیر وہی ہے جو سیّدنا علیؓ، سیّدنا عمرؓ اور سیّدنا عبداللہؓ ابن عباسؓ اور ان شاگردوں سے روایت ہے، ان صحابۂ کرام اور تابعین نے''فـالـمـقـسمٰت أمراً'' کے معنی فرشتے دیے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مختلف امورِ دنیا پر مامور ہیں۔ اور یہی معنی اس آیت کے دوسری صدی ہجری کے دو قدیم ماہرین لغت قرآن الفرّاء (م ۲۰۷ھ) اور ابوعبیدہ معمر بن المثنّی (م ۲۱۰ھ) نے علی الترتیب اپنی کتابوں معانی القرآن (ج ۳ ص ۸۲ طبعــه الهـیئة الـعـامة المصریة ۲۰۰۱ء) اور مجاز

---

(۱) لسان العرب میں یہ شعر مادّہ (امر) میں فی غلط طور پر ابوعبیدہ کے حوالے سے النمر بن تولب سے منسوب کیا گیا ہے۔ ابوعبیدہ کی مجاز القرآن (ص ۱۰۰) میں امرؤالقیس سے منسوب ہے اور النمر بن تولب کا شعر دوسرا ہے۔

القرآن (ج ۲ ص ۲۲۳، طبقہ بیروت، ۱۹۸۱ء) میں دیے ہیں۔فرّاء نے یہ معنی لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے:الملائکة تاتی بامرمختلف:**جبریل صاحب الغلظة ، ومیکائیل صاحب الرحمة، وملک الموت یاتی بالموت فتلک قسمة الامور** (فرشتے مختلف کام کرتے ہیں، جبریل سختی کرنے والے، میکائیل رحمۃ کرنے والے اور فرشتۂ موت (عزرائیل) روح قبض کرنے والے ہیں) یہ ملحوظ رہے کہ ان دونوں ماہرین لغت نے یہاں یہ معنی کسی صحابی یا تابعی سے نقل نہیں کیے ہیں۔مصر کی مجمع اللغة العربیة [Arab Academy] کی طرف سے دو جلدوں میں جو ضخیم معجم الفاظ القران الکریم (قرآنی الفاظ کی لغت) شائع ہوئی (۱۹۷۰ء القاہرة) ہے اس میں بھی **المقسِمٰت أمرا** کے معنی یہی دیے ہیں: **جماعة الملائکة الذین تقسِمون الاشیاء او الامور بین الناس باذن اللّٰہ**'' ساتھ ہی صیغۂ تمریض (مشکوک وضعیف) میں یہ بھی لکھ دیا ہے،''**وقیل: ھی الریاح تقسم الامطار بتصریف السحاب**''۔

اب اگر مولانا فراہی کو یہی ضعیف معنی پسند تھے اور یہی ان کے معتقد ومقلد غامدی صاحب کو پسند ہیں تو ہوا کریں، جمہور عرب ماہرین لغت مفسرین کے برخلاف اسی کمزور تفسیر کو صحیح کہہ کر پیش نہ کریں، اور عربی الفاظ کی صرف ایک شعر کی بنیاد پر دوراز کار تاویلات نہ کریں۔علم ایک میراث مشترک ہے، فضلائے سابقین اور خاص طور پر تفسیر قرآن میں صحابہ کے اقوال سے مستفید ہونا نقص علم نہیں۔مولانا فراہی کے مکتبۂ فکر کی یہی کمزوری ہے جس میں جاوید احمد غامدی صاحب بھی گرفتار ہیں۔یہی استبداد بالرای ہے۔

ایک قدیم عربی شعر کی شرح کرتے ہوئے، اپنے حفظ کردہ دوسرے قدیم جاہلی وغیر جاہلی اشعار پیش کر دینا علم نہیں تعالم یعنی اظہار علمیت ہے۔مولانا عبدالعزیز میمن مرحوم اور مولانا محمد سورتی مرحوم کو مولانا فراہی مرحوم سے کہیں زیادہ جاہلی وغیر جاہلی قدیم عربی اشعار یاد تھے، لیکن انھوں نے صرف ان اشعار کی بنیاد پر تفسیر قرآن نہیں کی۔القصائد السبع المعلقات یاد کر لینے سے عربی زبان نہیں آجاتی، یہی کمزوری ہمارے عربی مدارس کی ہے کہ وہاں ان قصائد (جن کو وہ غلط نام سبعۂ معلقہ دیتے ہیں) کو حفظ کرنے والے تو کافی مل جائیں گے لیکن صحیح اور اچھی عربی نثر لکھنے والا شاذونادر ہی ملے گا اور یہ ملکہ قرآن کو ادبی نقطۂ نظر سے پڑھنے اور کثرت سے عباسی عہد اور جدید دور کی عربی نثر کے مطالعہ سے پیدا ہوتا ہے۔

میں لکھنے تو جاوید غامدی صاحب کی عربی کے بارے میں بیٹھا تھا، بات ان کے استاد کے استاد مولانا فراہی کی تفسیر پر پہنچ گئی اور اسی پر دو تین صفحے ہو گئے لیکن ان کے طریقۂ تفسیر اور اس کے کمزور پہلوؤں پر، ان شاءاللہ، پھر کبھی لکھوں گا جب ان کی اصلی عربی تحاریر مہیا ہو جائیں گی۔

ساحل اپریل ۲۰۰۷ء

جاوید غامدی صاحب کی جو عربی نگارشات مجھے مہیا کی گئی ہیں، وہ ان کے مجلّہ ''الاعلام'' کے قدیم اعداد سے ہیں افسوس کہ ان کو غلط ترتیب دیا گیا ہے، اب میرے سامنے سورۃ الذاریات کی پہلی آیت پر پیش کردہ شعری شاہد کی شرح موصوف کے قلم سے ہے۔

محتاج تشریح اشعار سے استدلال: محض اظہار تعالم

مولانا فراہی نے لفظ قرآنی ''ذرواً'' کے معنی بیان کرنے کے لیے اعشی بکر بن وائل کا شعر پیش کر کے اس پر صرف دو سطریں بطور تشریح لکھی ہیں۔ مولانا فراہی نے تو تفسیر سورۃ الذاریات عربی زبان میں اہل علم کے لیے لکھی تھی۔ معلوم تھا کہ الفاظ: شبہ، حریق، الیبس الریح کے معانی سب جانتے ہیں اور یہ کہ فاء (ف) تعقیب کے لیے اور ''باء'' تعدیۃ الفعل کے لیے اور ''لام'' عہد کے لیے ہوتا ہے۔ یہ تو عربی زبان کے متوسط طلبہ بھی جانتے ہیں اس لیے انھوں نے ان عام عربی الفاظ اور حروف کی تشریح نہیں کی تھی، لیکن غامدی صاحب نے مولانا فراہی کے قاری کو بہت ضعیف العلم سمجھا اور ان عام فہم الفاظ وحروف کی شرح فرمانے لگے اور ان الفاظ وحروف کی تشریح میں جاہلی شعراء کے نو اشعار پیش کر دیے جو خود محتاجِ تشریح ہیں، اب بتایا جائے اس کو ''تعالم'' (اظہار ہمہ دانی) نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے؟

غامدی صاحب کا کمال: آسان الفاظ کی شرح مشکل ترین الفاظ سے قدیم کتابوں کے عربی جملوں سے نثر نگاری کا شوق

پھر طرفہ تماشا یہ کہ وہ ان عام الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے، عربی کے وہ نامانوس اور غیر مستعمل الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جو تشریح کردہ الفاظ سے بہت زیادہ مشکل ہیں، مثلاً وہ ''ریح الشمال'' (شمالی ہوا) کی تشریح میں فرماتے ہیں:

''قرت الایام وغامت السماء......وألقت فی صوادها ثلجا یبرک النیوب بالجعجاع''۔ اب قرت اور غامت کو چھوڑیے کہ شاید ذکی اور لایق طلبہ ان کے معانی جانتے ہوں، اگرچہ بہر حال یہ ''شبہ''، ''حریق'' اور ''ریح'' سے زیادہ مشکل الفاظ ہیں، لیکن خدارا یہ تو بتایا جائے کہ یہ صواد، نیوب اور جعجاع کون سے عام فہم اور مستعمل الفاظ ہیں جو جناب غامدی صاحب نے ریح الشمال کی تشریح میں استعمال کیے ہیں؟ یہ کیا؟ آسان الفاظ کی شرح مشکل الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے کبھی جو مقامات حریری پڑھی ہوگی اس کے کچھ الفاظ ان کے ذہن میں شرح شواہد الفراہی لکھتے ہوئے چپکے ہوئے تھے، شاید اب وہ خود ہی ان الفاظ کے معانی بغیر لغت دیکھے ہوئے نہیں بتا سکیں۔ پھر یہ کہ انہوں نے ایک عام فہم لفظ ''ریح'' جملے میں یہاں استعمال کیا ہے تو اس میں ٹھوکر کھائی ہے کہ ''وکثرت الریح'' لکھا ہے،

کثرت یہاں مہمل ہے اشتدت ہونا چاہیے، محل بھی اسی کا ہے کہ ذکر شمال کی شدید ہواؤں کا ہو رہا ہے۔ نتیجہ اس سے یہ برآمد ہوتا ہے کہ موصوف کو بعض قدیم کتابوں سے عربی کے جو جملے یاد ہیں وہ تو صحیح لکھ دیتے ہیں اگرچہ وہ خود محتاج تشریح ہوتے ہیں اور جہاں وہ خود خامہ فرسائی فرماتے ہیں تو وہاں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ اس کی مثالیں گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہیں، مزید اور سامنے آئیں گے، پہلے میں ان کے حفظ کردہ مشکل جملوں اور غیر مانوس الفاظ کی شرح کردوں۔

۱۔ **قـرّت الایـام**: دنوں کا ٹھنڈا ہوجانا، 'بَرَدَت' عام اور مستعمل لفظ ہے، اس کا مصدر قُرّ وقِرّۃ ہے، لیکن قرّت کے عام مستعمل معنی ٹھہرنے کے ہیں، اور یہ استقرت کا ہم معنی ہے، مگر اس صورت میں اس کا مصدر قرار ہے۔ کہا جائے گا کہ ''قرّت المراۃ فی بینھا'' یہاں بھی استقرت زیادہ فصیح اور مانوس ہے۔

۲۔ **غامت السماء**: انتشرت السحب فی السماء تشریح کے لیے زیادہ عام فہم ہے۔

۳۔ **صواد**: صادیۃ کی جمع ہے، معنی: بہت زیادہ پیاسی، بُرک (ی پر ضمہ) اونٹ کو بٹھانا، صوادی کھجور کے درختوں کو بھی کہتے ہیں۔ اس کا واحد بھی صادیۃ ہے۔

۴۔ **النیوب**: سن رسیدہ اونٹنیاں۔

۵۔ **الجعجاع**: تنگ ودشوار جگہ یا خراب موسم

غامدی صاحب سلیس وصحیح عربی میں ایک جملہ لکھنے پر قادر نہیں

اس جملے میں صرف دو لفظ **القت** اور **الثلج** عام فہم اور کثیر الاستعمال ہیں، باقی چار الفاظ غیر مانوس اور خاص طور پر صواد، نیوب اور جعجاع لغت کے الفاظ ہیں یا قدیم جاہلی۔ اور زبان نہ تو لغت کا نام ہے اور نہ جاہلی اشعار کا۔ عام عربی داں قاری کے لیے اس ثقیل وغیر فصیح جملے کا مطلب ہوگا کہ: ''سخت ٹھنڈی ہوا نے بلند و بالا کھجور کے درختوں پر سے اتنی برف گرائی کہ اونٹنیاں تنگ و غیر ہموار جگہوں پر بیٹھنے پر مجبور ہوگئیں۔'' معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب سلیس وصحیح عربی میں ایک جملہ لکھنے پر قادر نہیں اور ثقیل وغیر مانوس الفاظ کا سہارا لے کر وہ قاری پر اپنی عربی زبان دانی کا رعب ڈالنا چاہتے ہیں، لیکن یہ ریح الشمال کی تشریح کے سیاق میں انتہائی مضحکہ خیز اور لائق افسوس بھی ہے۔

مہمل، غلط در غلط عربی جملے

اسی ریح الشمال کی تشریح میں وہ آگے چل کر فرماتے ہیں، **الـریـح العـاصـفـة الشدیدة الـمرور**'' اس میں **الشـدیـدة المرور** تو قطعاً غلط ہے، اس لیے کہ ہوا کے چلنے کے لیے عربی زبان میں ھبوب کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، مــرور نہیں، مزید یہ کہ یہ جملہ ہی مہمل ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ

عاصفه تو کہتے ہی ہیں الریح الشدیدة الھبوب (سخت تیز ہوا: آندھی) کو، پھر یہ باقی الفاظ اسی کے ساتھ کیوں پروئے گئے ہیں؟

جو بات یہاں قاری کو بتانے کی تھی وہ یہ تھی کہ اگر چہ شاعر نے شعر میں ''ریح الشمال'' استعمال کیا ہے، لیکن صرف ''شمال'' بھی شمالی ٹھنڈی ہوا کہ کہا جاتا ہے۔

اگلی سطر میں موصوف اپنی شرح میں ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو خود محتاج شرح ہیں، یہ دو لفظ ہیں:

''سھوک الریح'': اگر جاوید غامدی صاحب یا کوئی اور القاموس دیکھے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ اس کے بنیادی معنی پسینے کی بدبو اور سڑے ہوئے گوشت کی بدبو ہے۔ اس لفظ کے اور بھی بہت سے معانی ہیں، ان میں سے ایک سھوک کے معنی سخت آندھی کے بھی ہیں، اور ریح ساھکة بھی آتا ہے، لیکن عام فہم اور فصیح لفظ ہوا کہ چلنے کے لیے ''ھبوب'' ہی ہے۔

''المحل'' بھی مشکل الفاظ کی شرح میں کسی طرح مناسب نہیں، فصیح اور عام عربی لفظ قحط ہے۔

غامدی صاحب کی عربی تحریروں میں ہمزہ لکھنے کی غلطیاں

''ازجاءھا'' یہ قرآنی لفظ ہے، خود محتاج شرح ہے، اس کی جگہ عام فہم لفظ سوق (س پر فتحہ) ہے، قرآن میں بضاعة مزجاة بھی ہے یعنی متاع قلیل۔ افسوس ناک بات یہ کہ غامدی صاحب نے اس لفظ کا املاء بھی اس جگہ غلط لکھا ہے چونکہ ازجاء یہاں مجرور ہے۔ اس لئے ہمزہ منفصلہ لکھنا درست نہیں بلکہ اس کو ایک شوشہ پر اس طرح (ازجائھا) لکھنا چاہیے۔ ھمزہ لکھنے کی یہ غلطی میں نے غامدی صاحب کی تحریر میں دوسری جگہوں پر دیکھی ہے۔ تنہا ھمزہ حالت نصب (مفعولی) میں لکھا جاتا ہے۔ اور حالت رفع میں (فاعلی) یہ واو پر ہوتا ہے۔ غامدی صاحب کو وسط کلمہ میں ہمزہ لکھنے کا قاعدہ دیکھنا چاہیے۔

ایک طرف تو موصوف نیوب، جعجاع، سھوک، محل، ازجاء جیسے ثقیل الفاظ استعمال کر رہے اور دوسری طرف مصیبة جیسے عام لفظ کی شرح فرمارہے اور اس کی غیر فصیح جمع ''مصیبات'' لکھ رہے ہیں۔ فصحاء کی زبان پر مصائب کا لفظ ہے، دوسری سطر میں اذکر بعضاً کے بجائے بعضھا ہونا چاہیے۔

''شدة القر'': القرّ (تشدید کے ساتھ) تو خود ہی محتاج شرح ہے، شدة البرد ہونا چاہیے، اسی کو تعالم کہتے ہیں، غامدی صاحب حریری کی طرح کوئی مقامہ تو نہیں لکھ رہے ہیں۔

پیش کردہ نو اشعار کا موضوع سے کوئی تعلق نہیں

''تعالم'' کی ایک اور واضح مثال جاہلی شعراء کے دس شعر ہیں جو موصوف نے اسی صفحہ (۴۲) پیش کیے ہیں جن میں سے ''ریح الشمال'' (شمالی سخت ٹھنڈی ہوا) سے کوئی تعلق نہیں، جس کی شرح میں جناب نے ۹ سطریں تحریر کی ہیں، یہ تمام اشعار جاہلی عربوں کی جود وسخا اور مہمانداری سے متعلق ہیں، اور سب میں اتنے مشکل الفاظ ہیں کہ ایک عام قاری جس کے لیے یہ شرح الشواہد لکھی گئی ہے، لغت کی کتابیں کھنگالنے کا محتاج ہے۔ اور پھر یہ کہ جاہلی عربوں کی یہ مہمان داری صرف ٹھنڈی ہواؤں سے مصائب کے موقع پر نہیں وہ تو ہر حال میں مہمان داری اور کھانا کھلانے کے لیے مشہور تھے۔

جاہلی اشعار وقصائد کا حفظ کر لینا زبان دانی کی علامت نہیں

غامدی صاحب عربی کا ایک صفحہ بھی درست نہیں لکھ سکتے

''کلاء'': اس لفظ کا یہ املاء غلط ہے، صحیح کلأ (ھمزہ الف کے اوپر) ہے، جیسے لفظ خطأ ہے اور خطّاء (بہت زیادہ غلطیاں کرنے والا) کے آخر میں ھمزہ ہے۔ آخر میں عرض ہے کہ سورۃ الذاریات کے قرآنی لفظ ''ذرواً'' کی شرح میں مفسر فراہی مرحوم نے ایک شعر لکھا تھا اور دو سطروں میں لفظ کی مناسب اور اطمینان بخش شرح کر دی تھی، غامدی صاحب نے اس شعر کی شرح میں اپنی علمیت کے اظہار کے لئے ۱۳ اس سے زیادہ مشکل شعر لکھ ڈالے جن کا موضوع سے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں ان سے پھر عرض کروں گا کہ جاہلی اشعار وقصائد حفظ کر لینا عربی زبان دانی کی علامت نہیں، عباسی دور میں عربی نثر کو جاہلی اشعار نے نہیں بلکہ قرآن نے اپنی معراج پر پہنچا دیا تھا جو جاحظ، ابن قتیبہ، المبرد، ابو الفرج الاصفہانی (صاحب الاغانی) اور ابن عبدربہ اور ابو حیان توحیدی وغیرہ کے منثور ادب میں اوج کمال پر ہے۔ جاہلی ادب (شعر) کے تو سینکڑوں الفاظ متروک ہو چکے ہیں، لیکن قرآن کی شگفتہ و دلآویز واثر آفرین زبان آج بھی زندہ ہے، سوائے معدودے چند: سیارۃ (بمعنی قافلہ) جاریہ (بمعنی کشتی، بحری جہاز) غلام (بمعنی ولد) وغیرہ الفاظ کے۔ عربی زبان کا شستہ اور شگفتہ ذوق اور سلیقہ رکھنے والا قرآن کی الہامی زبان سے متاثر ہو کر ایسی نثر لکھ سکتا ہے جسے پڑھ کر روح وجد میں آ جائے عصر حاضر میں یہ سعادت ''فی ظلال القرآن'' کے مصنف سید قطب شہید کو حاصل ہوئی ہے۔ میرا جاوید غامدی صاحب کو مخلصانہ مشورہ ہے کہ عربی زبان سے ان کو اگر اب بھی لگاؤ ہے تو یہ تفسیر پڑھیں جو داعیانہ مزاج اور ادب کے قلم سے لکھی گئی ہے، وہ دیکھیں گے کہ قرآن کی فیض رسانی سے کیسی معجزانہ نثر وجود میں آئی ہے۔ یہ بیسویں صدی کی بلا شبہ معجزاتی نثر ہے۔ سید قطب اس میں مصطفیٰ صادق الرافعی، احمد حسن الزیات اور طہ حسین جیسے اساطینِ ادب سے آگے نکل گئے ہیں۔ یہ سب کچھ

امرؤالقیس، نابغۃ ذبیانی، زھیر بن ابی سلمی اور عنترہ بن شداد وغیرہ جاہلی شعرا کے اثر سے نہیں ہو۔ ان قصیدوں کو پڑھتے رہنے اور حفظ کرنے والا ان میں اسیر ہوکر رہ جاتا ہے۔ وہ شگفتہ و دلآویز عصری نثر لکھ ہی نہیں سکتا، یہی غامدی صاحب کا معاملہ ہے شگفتگی اور دلآویزی تو دوسری بات ہے، قاری پر واضح ہو گیا ہوگا کہ وہ تو ایک صفحہ بھی صحیح عربی کا نہیں لکھ سکتے۔

غامدی صاحب کا ایک اور سرقہ:

آخر میں (الشاہد فیہ) کے تحت غامدی صاحب لکھتے ہیں: **ان الفاء الداخلة علی الصفات تدل علی الترتیب کما ذکرنا، وعلی انها متعلقة بموصوف واحد لا بموصوفات متعددة** یہ عربی قواعد کا ایک عام قاعدہ ہے نہ تو یہ کوئی انکشاف ہے اور نہ کسی غیر معمولی نحوی قاعدے کی نشان دہی۔ افسوس ہے کہ یہ بھی ان کا مولانا فراہی سے سرقہ ہے، بعینہ یہی الفاظ فراہی مرحوم کے ہیں۔ بس جناب غامدی نے اتنا کرم کیا ہے کہ یہاں وہ دعویٰ نہیں دہرایا جو مولانا فراہی نے کیا ہے، جو یہ ہے:

''پس یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ یہ (یعنی **والذاریات...... فالحملٰت...... فالجاریات...... فالمقسّمٰت**) مختلف چیزوں کی صفتیں ہیں، یہ بات نظائر قرآن اور کلامِ عرب کے خلاف ہے''۔

فراہی مکتبِ فکر: حضرت عمرؓ وعلیؓ اور ماہرین لغت کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا

فراہی صاحب، اصلاحی صاحب اور غامدی صاحب کا مشترکہ غرورِ علم

مولانا فراہی نے ایک جگہ اپنے اس مجموعہ تفاسیر میں لکھا ہے کہ تفسیر طبری اور رازی ان کے سامنے رہتی ہے۔ مگر اس ناچیز کا خیال ہے کہ شاید اس موقع پر طبری ان کے سامنے نہ تھی ورنہ وہ اتنے بڑے دعوے کی جسارت نہ کرتے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے اس دعوے کی ضرب کس پر پڑتی ہے؟ سیّدنا عمرؓ، سیّدنا علیؓ اور سیّدنا عبداللہؓ ابن عباسؓ جیسے فقہاء صحابہ پر ہے جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

طبری میں متعدد اسناد سے بتایا گیا ہے کہ حضرت علیؓ نے سورۃ الذاریات کی ابتدائی چار آیات **والذاریت ذرواً. فالحملٰتِ وِقراً. فالجاریات یسرا. فالمقسّمٰتِ امراً.** میں فرمایا کہ **الذاریات** سے ہوائیں اور **الحاملات** سے بادل اور **الجاریات** سے کشتیاں اور **فالمقسّمٰت** سے فرشتے مراد ہیں۔ اور حضرت علی نے ان آیات کے یہ معانی یا تفسیر جیسا کہ اوپر مذکور ہوا منبر پر کھڑے ہوکر اس دعوے کے بعد بتائی تھی کہ: ''**لایسأ لنی احد عن آیة من کتاب الله الا اخبر ته**''۔ (کہ جو کوئی بھی مجھ سے قرآن کی کسی آیت کے معنی پوچھے گا میں اس کو بتا سکوں گا)۔ جس پر تاریخ میں مشہور ہونے والے ایک شخص عبدالدین الکواء نے ان چاروں آیات کے معانی پوچھے اور آپ نے بتائے، یہ شخص بعد میں

خوارج کا ایک رہنما ہوا۔ اس سے پہلے انھیں آیات کی تفسیر ایک ایسے ہی اور معترض وعنید شخص صبیغ ابن عسل (ع پر زیر س پر جزم) نے حضرت عمرؓ سے پوچھی تھی، جس پر انھوں نے اس کے کوڑے مارے اور اس کو بصرہ میں جلا وطن کر دیا تھا۔

یہ واقعہ قرطبی اور ابن کثیر دونوں میں ہے، حافظ ابن کثیر نے اس کو ایک مشہور قصہ بتاتے ہوئے اس سزا کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اس نے حضرت عمرؓ سے یہ سوال اس نے ہٹ دھرمی اور آپ کو زک پہنچانے کے لئے کیا تھا جس میں آیات قرآنی پر اعتراض کی صورت تھی۔ حضرت عمرؓ نے بھی اس صبیغ التمیمی کو ان آیات کے وہی معنی بتائے تھے جو بعد میں حضرت علیؓ نے عبداللہ بن الکواء کو بتائے۔ یہی نہیں بلکہ یہ تفسیر مجاہدؒ، سعید بن جبیرؒ، الحسن البصریؒ، قتادہؒ، السدیؒ وغیرہ کتنے ہی تابعین سے مروی ہے۔

فراہی مکتب فکر عقلیت میں ''معتزلی'' مفسر ''زمخشری'' سے بھی آگے

قرطبی اور ابن کثیر سے قبل مشہور عقلیت پسند (معتزلی) مفسر زمخشری نے بھی ان آیات کے وہی معنی بتائے ہیں، جو اوپر منقول ہوئے، اور اس نے بھی بعد میں حضرت علیؓ کی تفسیر کو نقل کیا ہے، ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ ذاریات، حاملات، جاریات اور مقسّمات سے مختلف ہوائیں بھی مراد ہو سکتی ہیں اور یہی مسلک بعد کے مفسرین کا ہے۔ لیکن دوسری صدی ہجری کے مذکورہ بالا دو اہل لغت الفراء اور ابو عبیدۃ نے تو اپنی مذکورہ بالا کتابوں میں ان چاروں آیات کے معنی: ہوائیں، بادل، کشتیاں اور فرشتے ہی مراد لیے ہیں۔ مولانا فراہی قدیم مفسرین کو تو درخور اعتناء نہیں سمجھتے تھے لیکن یقین ہے کہ وہ ان دونوں ماہرین لغت کے مرتبے سے واقف ہوں گے۔ مرحوم کے زمانے میں ان کی دونوں کتابیں مطبوع نہ تھیں، مجھے یقین ہے کہ یہ کتابیں ان کے سامنے ہوتیں تو شاید وہ اپنی رائے بدل دیتے، لیکن جاوید غامدی صاحب کے زمانے میں تو یہ کتابیں مطبوع ہیں، ان کے پاس کوئی عذر نہیں کہ وہ مولانا فراہی کی تفسیر ہی کو صحیح سمجھیں۔ بہر حال مولانا فراہی کی یہ بات کسی طرح قابل قبول نہیں کہ:

> ''پس یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ یہ مختلف چیزوں کی صفتیں ہیں، یہ بات نظائر قرآن اور کلام عرب کے خلاف ہے''۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ سیدنا عمرؓ اور سیدنا علیؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، اور دسیوں تابعین اور اُن کے فوراً بعد دو قدیم ترین مشہور ماہرین لغت نے ان چار آیات کے معانی چار مختلف چیزیں بتائی ہیں تو ان کی اس رائے کی کوئی وقعت نہیں رہتی کہ یہ بات نظائر قرآن اور کلام عرب کے خلاف ہے''۔ کیا تیرہ سو سال بعد کا ایک عجمی مصنف ان سے زیادہ کلامِ عرب کا راز داں ہو سکتا ہے!! اسی کو میں نے سابق صفحے میں

غرورِ علم کہا تھا جو غامدی صاحب کو بھی ورثہ میں ملا ہے۔

اوّلیت تفسیر ماثور کو حاصل ہے، عقلیت اور کلام جاہلیت کو نہیں

ایک اہم بات یہ کہ مولانا فراہی نے ''والذاریات'' کے بعد کی تین آیتوں میں حرف عطف (ف) کے ورود کو اس بات کو دلیل بنایا ہے کہ ''ان صفات میں ترتیب ہے نیز ان سے یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ یہ سب ایک ہی چیز کی صفتیں ہیں''۔ (مجموعہ تفاسیر فراہی ص ۱۴۷) نابغۂ روزگار مفسّر اور ماہر لغت ونحو (مصنف اساس البلاغہ والمفصل فی النحو) زمخشری نے اس موقع پر حرف (ف) پر کلام کرتے ہوئے کہا ہے کہ: ''پہلے معنی (چار مختلف چیزیں) کی صورت میں تو یہ ف ''تعقیب'' کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہواؤں کی قسم کھائی، پھر بادلوں کی، پھر کشتیوں کی، پھر فرشتوں کی، جو اللہ کے حکم سے رزق تقسیم کرتے ہیں بارشوں اور سمندری تجارت کے ذریعہ' ساتھ ہی اس نے دوسرے معنی ترتیب کے بھی لکھ دیے ہیں کہ پہلے ہوائیں چل کر مٹی اڑاتی ہیں، بادلوں کو اٹھاتی ہیں۔ پھر فضا میں ان بادلوں کو پھیلاتی ہیں، پھر بارش تقسیم کرتی ہیں۔ یہی عملی طریقہ ہے کہ زمخشری نے دونوں نقطۂ ہائے نظر پیش کر دیے ہیں اگر چہ اولیت اس کے یہاں تفسیر ماثور (صحابہؓ وتابعینؒ سے منقول) کو ہے۔

زمخشری کے قول سے معلوم ہوا کہ (ف) صرف تعقیب (یعنی بمعنی واو) کے لیے بھی ہوتی ہے اور ترتیب کے لیے بھی۔ اِسی طرح (ثم) بھی حرف عطف ہے اور ترتیب کے لیے ہوتا ہے، لیکن یہی (ثم) قرآن میں متعدد جگہ صرف عطف کے لیے یعنی (واو) کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ اس طرح (ف) کے عطف سے ہمیشہ ایک ہی موصوف مراد نہیں ہوتا۔

قرآن نحوی قواعد کا تابع نہیں قرآن سے قواعد نحو مرتب ہوں گے

قرآن میں سورۃ ''المرسلات'' کی ابتدائی آیات ہیں: **والمرسلٰتِ عُرفا. فالعٰصفٰتِ عصفا. والناشرات نشرا. فالفارقات فرقا. فالملقیٰت ذکراً**۔ یہاں پہلی تین آیات ہواؤں کے لیے ہیں، اور آخری دو آیات **بداھۃً** فرشتوں کے لیے ہیں۔ کہ حق و باطل کی تمیز ہوائیں نہیں کرتیں اور نہ ذکر، یعنی اللہ کا کلام اور وحی ہوائیں لے کر آتی ہیں بلکہ یہ فرشتے لاتے ہیں۔ اور یہی وہ معنی ہیں جو تفسیر ابن کثیر میں حضرت عبداللہؓ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ اور متعدد تابعی مفسرین سے مروی ہیں۔ اور عبداللہ بن مسعودؓ وہ صحابی ہیں جنھوں نے بخاری کی روایت کے مطابق بیان کیا ہے کہ جب یہ سورت نازل ہوئی تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں ایک غار میں تھے جہاں سورت کا نزول ہوا۔ اور **فالملقیٰت ذکراً** ۔ کے متعلق تو قرطبی وابن کثیر دونوں نے یہ کہا ہے کہ اس بات میں کسی کا اختلاف نہیں کہ

اس سے مراد فرشتے ہیں کوئی شک نہیں کہ نحویوں نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ (ف) ترتیب وتعقیب کے لیے ہوتی ہے اور اسی کو بنیاد بنا کر انھوں نے سورۃ الذاریات کی ابتدائی مذکورہ بالا چار آیات کی تفسیر صحابہؓ وتابعینؒ کے برخلاف مختلف ہواؤں سے کی ہے۔لیکن اس قاعدہ کا استثناء بھی ہے۔قرآن نحوی قواعد کا تابع نہیں، بلکہ قرآن ہی سے نحوی قواعد مرتب کیے گئے ہیں۔

مولانا فراہی نے سورۃ الذاریات کی زیر بحث چار آیات کی اپنی من مانی تفسیر کے لیے صرف ایک مثال سورۃ العادیات سے پیش کی ہے، ہم نے اس کے مقابل مثال سورۃ المرسلات سے پیش کردی ہے۔اور پھر چوتھی آیت فالمقسمٰت امراً کی ان کی تفسیر تو قرآن کی ہم معنی دیگر آیات کے بالکل خلاف ہے۔کیونکہ جو بات سورۃ الصافّات کی تیسری آیت فالتالیات ذکرا اور سورۃ المرسلات کی آیت نمبر ۵ فالملقیت ذکراً میں کہی گئی ہے وہی سورۃ الذاریات کی اس آیت میں کہی گئی ہے کہ: فرشتے اللہ کا ذکر تلاوت کر کے انبیاء کو سناتے ہیں جیسے حضرت جبریل حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کی وحی لاتے اور تلاوت کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصائح اور احکام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچاتے تھے اس طرف یہ فرشتے مختلف امور پر مامور ہیں۔

فراہی صاحب کا تضاد فکری

یہاں قاری کے لیے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ مولانا فراہی ''والسمآء ذات الحبک'' کے ترجمہ میں تضاد کا شکار ہیں، انھوں نے صفحہ ۱۴۳ پر اس آیت کا معنی لکھا ہے: ''قسم ہے دھاریوں والے بادلوں کی'' اور صفحہ ۱۵۹ پر اس کا ترجمہ کیا ہے: ''دھاریوں والے آسمان کی''۔اب غامدی صاحب ہی اس تضاد کو حل کریں۔

آخر میں عرض ہے کہ ان سب لغوی اور تفسیری بحثوں سے قطع نظر قارئین خود ہی فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اللہ کے وعدے کی سچائی اور روز قیامت کے اثبات: ان ّما توعدون لصادق . وان الدین لواقع۔ کے لیے یہ بات زیادہ وزنی اور اثر انگیز ہے کہ اللہ تعالیٰ چار چیزوں: ہواؤں، بادلوں، کشتیوں اور فرشتوں کو گواہ بنائے جیسا کہ صحابہؓ اور جمہور مفسرینؒ کی تفسیر ہے، یا صرف ہواؤں کو گواہ بنانا جو مولانا فراہی اور ان کے شاگرد ومعتقد غامدی صاحب کی تفسیر ہے۔خود رائی اور تعصب سے بری ہر منصف مزاج انسان جمہور کی بات کو صحیح سمجھے گا۔ارادے کے بغیر مولانا فراہی کی تفسیر پر گفتگو ہوگئی، شاید اس میں کوئی کام کی بات ہو۔